# گاہے گاہے باز خواں آں قصۂ پارینہ را

محمد ظفراللہ ( پوکا ٹیللو، ایبٹ آباد)

میرے مرحوم دادا جان، ٹھیکیدار محمد شفیع صاحب سڈل، نے خلافت اولی کے دوران احمدیت قبول کی۔خلافت ثانیہ کے اولین دنوں میں، خواجہ کمال الدین صاحب کے زیر اثر ہونے کے باعث، بیعت میں توقف کیا ۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد جب خدا تعالی نے دل اس طرف پھیر دیا تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیعت کا خط مع معافی کی درخواست کے ارسال کیا۔( شنید ہے کہ یہ خط بعد کو اخبار البدر میں شایع ہوا) خیر تو اس کے کچھ عرصے کے بعد ہی مختصر سی علالت کے بعد دادا جان تقریبا جوانی ہی میں وفات پا گیے۔

دادا جان سےخاصہ عرصہ ملاقات نہ ہونے پر ان کے ایک دوست حاجی محمد موسی رضی اللہ عنہ(نیلا گنبد والے) کو فکر ہوی۔ لاہور سے سیالکوٹ اور سیالکوٹ سے تانگے میں بیٹھ کر کوٹلی لوہاراں مغربی پہنچے۔دادا جان کی وفات کا سن کر اظہار تعزیت کیا اور حالات دریافت کیے۔پتہ چلا کہ دادا کی وفات کے بعد ان کے کارندوں نے،جو کہ زیادہ تر گاوں ہی کے اور اپنے رشتہ دار ہی تھے، وہ سب کچھ خرد برد کر لیا تھا جس کے لیے دادا جان یا انکے وارثوں کے دستخط کی ضرورت نہ تھی۔ بچے سب چھوٹی عمر کےتھے،میرے سب سے بڑے تایا کی عمر چودہ یا پندرہ سال تھی اور میرے ابا پانچ سال کے تھے۔

دادا چونکہ ریلوےکے پلوں کی تعمیر سے متعلق ٹھیکے لیتے تھے ، حکومت کے ساتھ لین دین تھا لہذااس بات کا اطمینان تھا کہ جو ادایگیاں باقی تھیں وہ محفوظ تھیں۔جب میری دادیوں کو اس طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو دوسرے دکھ بھی یاد انے لگے۔ بڑا دکھ یہ تھا کہ دادا کی وفات کے بعد میرے سب چچا تایاوں کی مانگیں چھن گیی تھیں۔ (منگنیاں ٹوٹ گیی تھیں۔) اس کا علاج حضرت حاجی صاحب نے یہ کیا کہ اپنی ایک بیٹی مریم صاحبہ کی شادی میرے بڑے تایاعبدا لخالق صاحب سے طے کردی۔ اللہ اللہ،اسے کہتے ہیں ایثار۔ کہاں حضرت حاجی صاحب، لاہور کے ایک معروف اور صاف ستھرے علاقے کے رہنے والے اور کہاں ضلع سیالکوٹ کے ایک دور افتادہ گاوں کےمکین میرے دادا اور انکی اولاد۔

منا سب لگتا ہے کہ میں اپنے گاوں کے اس زمانے میں دور افتادہ ہونے کی کچھ تفصیل بیان کردوں اور اپنے گھرانے کے بھی کچھ حالات بیان کردوں تا کہ قاری کو حضرت حاجی صاحب کے ایثار کا بہتر اندازہ ہو جاے۔ہمارا گاوں کوٹلی لوہاراں سیالکوٹ شہر سے تقریبا آ ٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اجکل شہر سےدو سڑکیں کوٹلی لوھاراں جاتی ہیں۔ ایک سڑک چھاونی سے ہوتی ہوی کھروٹہ سیداں کے رستے کھیتوں میں سے گزرتی ہوی پہلے کوٹلی لوھاران مشرقی اور پھر کوٹلی لوہاران مغربی پہنچتی ہے۔ دوسری سڑک جو سیا لکوٹ سے سیدھی ہیڈ مرالہ جاتی ہے دونوں کوٹلیوں کے درمیان سےگزرتی ہے۔

دوسری سڑک نیی ہے۔لہذا حاجی صاحب پہلی سڑک کے رستے گیے ہونگے۔جو کہ سڑک کم اور کچا رستہ زیادہ تھی۔ عام دنوں مین سیالکوٹ اور گاوں کے درمیان تانگے کا سفر ۱۹۵۰کے زمانے کے لگ بھگ بھی ایک صحتمند آدمی کی چولیں ہلانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔اور حضرت حاجی صاحب تو گیے بھی برسات ہی کے زمانے میں تھے۔ عمر بھی حاجی صاحب کی اس وقت کافی تھی۔ آجکل میں اکثر سنتا ہوں کہ لڑکی کے باوا نے صاف کہ دیا کہ میری بیٹی یہ ملک

چھوڑ کر نہیں جاے گی۔ اس تناظر میں حاجی صاحب کا میرے گھرانےسے رشتہ جوڑنے کا فیصلہ حیران کن ہی لگتا ہے۔

قبل اس کے کہ کوی قاری کچھ اور سوچنے لگیں حاجی صاحب کے اس فیصلہ کی بنیادی وجہ بتاتا چلوں۔میری بڑی دادی نے، جو کہ میری حقیقی دادی تھیں، احمدیت قبول نہ کی ۔ ان کا خیال تھاکہ میرے دونوں بڑے تایاوں کو کہہ دینا چاہیے کہ ٹھیک ہے ہم احمدیت چھوڑتے ہیں، اب رشتے دو۔ ان کے خیال میں شادیاں ہو جانے کے بعدکون پوچھتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ حاجی صاحب کی باریک بین نگاہ نے بھانپ لیا تھا کہ اکیلا چھوڑنے کے نتیجہ میں یہ گھرانہ احمدیت سے دور ہو جاے گا۔

ایک اور وجہ بتاتا چلوں۔ جو کہ بعض اوقات لوگوں کو کفو کا مسئلہ یاد دلا سکتی ہے۔ ہم لوگ لوہار ہیں اور پرکھوں کے زمانے سے ہمارے پاس زرعی زمینیں بھی ہیں۔اس لحاظ سے ہمارا گھرانہ ایک زمیندار گھرانہ تھا۔ گھر گو کہ نیا تھا اور اسے دادا نے ایک حویلی کی صورت میں بنایا تھا پر اس گھر میں بھینسیں بندھتی تھیں، گاؤں کے رواج کے مطابق۔(اس بات پر اللہ تعالیٰ مغفرت کرے میری بڑی تائ صاحبہ کو ایک عرصے تک اعتراض رہا۔ پھر، وہ کیا کہتے ہیں کہ، بو رچ گئ دماغ میں۔)

اللہ تعالی مغفرت کرے میری بڑی تائ، جنہیں ہم تائ مریم کہتے تھے، ہمارے خاندان کو احمدیت کے ساتھ منسلک کرنے والی روح ثابت ہویں۔ کہنے کو وہ میری سوتیلی تای تھیں، پر مجھے اور میرے بہن بھایوں کو کبھی اس کا احساس نہ ہوا۔انکی اولاد نے بھی ہمارے ساتھ بھایوں بہنوں والا سلوک رکھا۔ کسی اور چچا یا تایا کی اولاد کے ساتھ ہمارا اس قدر پیار کبھی نہ ہوا۔

اللہ تعالی حاجی صاحب کوجزاے خیر دے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہمارے خاندان میں احمدیت ان ہی کی وجہ سے رہی۔ بہر حال اللہ تعالی مسبب الاسباب ہے، اسی نے حاجی صاحب کے دل میں دادا جان کو تلاش کرنے کا خیال ڈالا۔ اسی نے ان کے دل میں سلسلے کی اور اپنے احمدی دوستوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اسی نے ان کو احمدیت کی خاطر اپنی بیٹی کو قربان کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔

اس کے بعد حاجی صاحب میرے بڑے تایا کو ساتھ لے کر لاہور گیے۔ ٹھیکوں کے بقایا جات واگزار کروانے میں مدد فرمای اور گویا نا امیدی سے ہمارے گھرانے کو نکالا۔ بڑے تایا نے دادا جان کے نام کے توسط سےمیرے دوسرے تایا عبدالمالک کو ساتھ ملا کر ریلوے کے ٹھیکے لینا شروع کیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تد بیر اور کاروباری سمجھ بوجھ ہمارے گھرانے سے دادا جان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیی تھیں۔ لیکن جو تکنیکی فہم اللہ تعالی نے دادا کو ودیعت فرمایا تھا اس کی جھلک اب بھی ہم لوگوں میں نظر آ جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال کچھ یوں ہے کہ جب سکھر کے آرچ برج کا

منصوبہ شروع ہوا تو اس کے ڈیزاین کے مطابق گرڈرز میں رِوَٹسس ٹھونکی جانا تھیں۔

کیی ٹھیکیدار وں کی ناکامی کے بعد یہ خبر عام ہوی کہ یہ کام ممکن ہی نہیں۔

تایا عبدالخالق مرحوم کی ان دنوں مالی حالت بے حد خراب تھی اور ایک ٹھیکہ لینے کی ان میں قطعی کوی سکت نہ تھی۔ یہ سن کر کہ بعض لوگوں کے نزدیک کام ممکن نہیں پہنچ گیے اپنے کاغذات لیکر۔ کام کی نوعیت دیکھ کر اپنا پلان بتایا تو انجنیرزنے فوراً ٹھیکے کی منظوری دے دی۔ تایا نے کہا کہ اب میں جاتا ہوں تاکہ کوی پیسے اور لیبر وغیرہ کا انتظام کروں۔اس پہ ان کو کہا گیا کہ پیسہ اڈوانس لے لو اور لیبر کے لیے اپنے بھای کو لکھ دو۔ تو تایا عبدالمالک کو تار دیکر بلوایا اور گویا کام شروع کیا۔ سکھر کا پل بنا۔ پر شاباش ہے میرے شیر کے میرے تایا ابا پل کا ٹھیکا ختم ہونے پر پھر خالی ہاتھ کے خالی ہاتھ تھے۔

خیر مال دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ ایمان اور سلسلے کے ساتھ محبت ایک لا زوال تحفہ ہے ،جسے اللہ تعالی دے۔ اس کے لیے ہم اللہ تعالی کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔اور ذاتی طور پر میں حضرت حاجی صاحب کا ممنون ہوں کہ انکی بر وقت مدد کے باعث میرے گھرانے میں احمدیت باقی رہ گیی۔ لگتا ہے حاجی صاحب کی توجہ، با وجود میرے بڑے تایا وں کے لا اوبالی پن کے، ہمارے خاندان پر رہی، حاجی صاحب کے خاندان کے ساتھ تعلقات کچھ اور بڑہے اور میرےایک اور تایا عبدالعزیز انکے داماد ہوے لیکن میرے لیے اس پہلی شادی کی ، ان حالات کے تناظر میں، بےحد اہمیت ہے

اس قصے کے سبھی کردار اپنے خالق حقیقی کے پاس جا چکے ہیں۔ لیکن ان کےنیک اعمال کے نتایج اور انکے بہت سے ورثا اب بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔ اللہ تعالی حضرت حاجی صاھب کے درجات بلند کرے۔ ان کی توجہ سے جہاں احمدیت ہمارے خاندان میں رہی وہاں ہم بعد میں آنے والوں کو یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارے مرحوم دادا کو بھی اللہ تعالی نے ایسی شخصیت سے نوازا تھا کہ گاہے ماہے جلسوں پر ملاقات کرنے والے دوست کو بھی ان سے ملاقات نہ ہوسکنے پر اتنی تشویش ہوی کہ ہر چہ بادا باد کہہ کر ان کا پتہ لگانے نکل کھڑے ہوے۔فا لحمد للللہ علی ذالک۔

ابا مرحوم کی طبیعت کچھ سیلانی تھی۔ اس لیے وہ بہت کم گاوں میں رہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہم لوگ بھی زیادہ عرصہ گاوں سے باہر ہی رہے۔ میری گاوں کی یاد داشتیں ان چند سالوں پر مبنی ہیں جب حالات ہمیں کو ٹلی لوہاراں لے گیے۔ اپنی ہوش میں میں پہلی بار گاوں اس وقت گیا جب ہم نے قادیان سے ہجرت کی۔ قادیان سے لاہور کانواے میں سفر، اپنے ننہال کے ساتھ، پھر جودھا مل بلڈنگ میں کچھ عرصہ رھنا بس خواب کی طرح یاد ہے، اور پھر لا ہور سے کلاسوالہ جانا۔ پھر وہاں سے گاوں جانا اپنی اماں اور بھایوں کے ساتھ ۔ یہ سب یادیں گویا خاموش تصا ویر کی طرح ذہن کے پردے

پرمرتسم ہیں۔ ابا مرحوم ان دنوں حیدر آباد دکن میں تھے، اور تقسیم ملک کے بعد کی بد نظمی کے باعث مفقودالخبر۔

خیر تو ابا جب پاکستان آے اور کراچی میں کاروبار شروع کیا تو ہم ان کے پاس کراچی چلے گیے۔ لگتا ہے کہ ملک کے بدلے ہوے حالات ابا کو راس نہ آے اور ان کے قدم کہیں جم نہ پاے۔ آخر سن ۱۹۵۷ میں۔ ابا نے فیصلہ کیا کہ ہم لوگوں کو گاوں چھوڑ کر خود کہیں باہر قسمت آزمای کریں۔ میں اس وقت پندرہ سال کا تھا اور چھ سات مختلف سکولوں میں پڑھتا ہوا چھ جماعتیں پاس کر چکا تھاخیر تو ہمیں گاوں چھوڑ کرابا مرحوم جو باہر جانے کے لیے نکلے تو مشرقی پاکستان جا اٹکے۔ ابا کو وہاں قدم جمانے میں جو وقت لگا وہ ہم لوگوں کے لیے بے حد یادگارہے۔ اس دوران میں مجھے اور میرے بھایوں کو اپنے پاوں پر کھڑا ہونے کی تربیت ملی۔اسی دوران میں ہمیں اپنے تایا زادوں اور تای مریم کی ہمارے خاندان کے ساتھ محبت کا احساس بھی ہوا۔

اسی زمانے میں پتہ چلا کہ کوٹلی لوہاراں مغربی میں ابتدا ءً دو بھایوں کی اولاد رہتی تھی۔ بڑے بھای کی اولادکو وڈے ٹبر والے یا عیال کلاں کہتے تھے اور چھوٹے بھای کی اولاد کو گھوے کہتے تھے، اور کہ ہم عیال کلاں تھے۔ میری تایا زاد بہنیں (تایا عبدالخالق صاحب کی بیٹیاں) جو کہ ہم سے عمر میں بڑی تھیں بتایا کرتی تھیں کہ گھوے وڈے ٹبر والے مردوں کو تایا کہتے تھے،بلا لحاظ عمر، اوروڈے ٹبر والی عورتوں کو پھوپھی، بلا لحاظ عمر۔( آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔)

اسی زمانے میں میں نے اپنی دادی جان مرحومہ سے حضرت حاجی صاحب کے تشریف لانے کا واقعہ سنا۔اور یہ بھی سنا کہ دادا جان جلسہ سالانہ پرقادیان کے لیے بوگی ریزرو کروایا کرتے تھے کہ گاوں سے جو بھی جلسہ پر جانا چاہے، پیسوں کی کمی کی وجہ سے نہ رہ جاے۔ بتایا کرتی تھیں کہ بہت سے لوگ احمدی ہو گیے تھے دادا کی زندگی میں، لیکن دادا کی بے وقت موت اور اس کے بعد گاوں کے ملاوں کے زیر اثر بہت سے لوگ پھر گیے۔ دادی جان سے یہ بھی پتہ چلا کہ دادا مرحوم بہت سی بیواوں کی در پردہ مدد کیا کرتے تھے۔ دادا کی وفات کے بعد بعض بیواوں نے رو رو کر کہا کہ انھیں اپنی بیوگی کا اب احساس ہوا ہےمجھے اکثر یہ احساس دکھی کرتا ہے کہ میرے گاوں والوں نے، جن میں سے بیشتر میر ے اپنے رشتہ دار ہی ہیں، میرے دادا کی قدر نہ کی اور ملاوں کے فتووں کے جال میں پھنس کر احمدیت سے محروم رہ گیے۔

اسی زمانے میں میں نے اپنے دادا جان کا یہ قول بھی سنا کہ کما تو ہر کوئ لیتا ہے مگر سنبھالنا کسی کسی کو آتا ہے۔ اللہ تعالی انکے درجات بلند کرے انہوں نے اپنی کمائ کو اپنی دانست میں خوب سنبھالا۔ اس چھوٹی سی عمر میں۔ ہر بیٹے اور ہر سوتیلے بھای کے لیے ایک مکان بنایا۔ (دادا کے دو سوتیلے بھای تھے جن کا انہوں نے اپنی اولاد ہی کی طرح خیال رکھا) پر وہ کیا کہتے ہیں کہ تدبیر کرے بندہ اور تقدیر کرے خندہ۔ ان کی بے وقت موت نے تمام منصوبے درہم برہم کر دیے۔ایسے میں حضرت علی رضی اللہ کا قول یاد آتا ہے ً عرفت ربی بفسخ العزایم ً

بعض باتیں جوکہ لوگ باتوں باتوں میں کر جاتے ہیں، اپنا انمٹ نقش ایک زخم کی صورت میں چھوڑ جاتی ہیں۔ ابا مرحوم کے ایک پھوپھا تھے جنہوں نے اپنی غربت کے زمانے میں، میرے تایاوں کی

مہربانی کا فایدہ اٹھاتے ہوے ہماری زمین پر ایک ٹیوب ویل لگایا تھا۔ (مہربانی سے زیادہ یہ وجہ بھی رہی ہوگی کہ ہمارا کنواں اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اس پر رہٹ چلانا سراسر گھاٹے کا سودا تھا)۔ خیر تو ان کے بیٹے جب خلیج کی ریاستوں میں نوکر ہو گیے تو ان کے دن بھی پھر گیے۔ لیکن بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق وہ اس ٹیوب ویل کوایک پرانے سے ڈیزل انجن کے ساتھ کسی نہ کسی طور چلاے رہتے تھے۔ اس کسی نہ کسی طور چلانے کا مطلب کچھ یہ نکلتا ہے کہ وہ اکثر اس انجن کو کھول کر بیٹھے اس کی مرمت میں مصروف دکھای دیتے تھے۔ مجھے اور میرے بھایوں کو مشینوں کے ساتھ رغبت اپنے نانا، مستری محمد حسین صاحب گھڑی ساز مرحو م (آف فرید کوٹ) سے ملی تھی۔ لہذا اکثر ان کے ٹیوب ویل پر ان کی اس دقیانوسی انجن کے کھولنے اور واپس جوڑنے میں مدد کرتے دکھای دیتے تھے۔ میرا دوسرے نمبر پرچھوٹا بھای ناصر احمد تو گویا ان کا باقایدہ شاگرد تھا۔

خیر تو ایک روز میں تھا انکے پاس، اور وہ مصروف تھے اس انجن کی شافٹ کے بشوں کو چھیل چھیل کر ًفٹ کرنے میں۔ ایسے میں، جو دم لینے کو رکے تو، خدا جانے ان کو کیا سوجھی کہ کہتے ہیں تمہارے دادا نے تکبر کیا تھا کہ میں چاہوں تو آدھا ضلع سیالکوٹ خرید لوں۔ اسی تکبر کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تم لوگ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو۔ ان کی اس بات کو میں اس وقت تو پی گیا، پر گھر آکر میں نے طوفاں کھڑا کر دیا۔ صحن کے عین درمیان میں کھڑے ہوکر، تاکہ دادی جان اور تای اماں بھی سن لیں، شروع ہوگیا، جھوٹ بولتے تھے میرے دادا کہ وہ آدھا ضلع سیالکوٹ خرید سکتے تھے۔ اگر ان کے پاس اتنا تھا تو آج اس میں سے کچھ نظر کیوں نہیں آتا؟ اس روز مجھے پتا چلا کہ دادا مرحوم کے پاس تو بہت تھا پر اس میں سے کچھ تو آخری ٹھیکے میں نقصان کی نظر ہو گیا ، کچھ ان کی بیماری، کچھ انکے کارندوں کی بے ایمانی اور کچھ انکے بعد کی بد انتظامی کی نظر ہو گیا۔

بہت کچھ تتو تھمبو کے بعد میں کچھ ٹھنڈا تو پڑ گیا لیکن دادا مرحوم کے خلاف دماغ میں گرہ بیٹھ گیی کہ عجب بر خود غلط آدمی تھے۔ اگر اتنی پسلی نہیں تھی توبڑا بول بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ باوجود اس کے کہ ابا مرحوم نے بتا رکھا تھا کہ اپنی آخری بیماری کے دوران دادا جان نے انکے سامنے سنار کو گھر بلا کراشرفیاں گلواکر سونے کی سات اینٹیں ڈھلوای تھیں، پانچ بیٹوں اور دو بھایوں کے لیے۔ پر بھلا سونے کی سات اینٹوں یعنی چند اشرفیوں سے آدھا ضلع سیالکوٹ خریدا جا سکتا ہے؟ اس بات کا ادراک کہ ہو سکتا ہے دادا ابا نے ایسی کوی بات کی ہی نہ ہو، تقریبا حال ہی میں، چند سال پہلے ہوا۔ میں جب سے امریکہ آیا ہوں بیماری اور غربت کا شکار ہوں۔ اس غربت کا ایک حد تک باعث میری تنک مزاجی، اورجو بات سمجھ میں آے اسے بغیر لگی لپٹی کے پٹاخ سے منہ پر مارنے کی عادت بھی ہوسکتا ہے۔ پر الحمد للہ۔ میں اپنے حال پر مطمین تھا، یہ سوچ کر کہ ارے میرے دادا نے اتنا کما کر کیا کمای کرلی؟ ایسے میں میریلینڈ کے جلسہ سالانہ پر ایک صاحب سے ملاقات ہوی، جو لندن سے آے تھے اور میرے اس زمانے کے واقف تھے جب میں اپنی ڈاکٹریٹ کے لیے ریسرچ کر رہا تھا۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ ارے تم وہی ہو نا جو یہ کہتا تھا کہ میں پروفیسر عبدالسلام صاحب سے اور چوہدری ظفراللہ خان صاحب سے بھی آگے نکل جاوں گا۔ حاشا میں نے ایسی کوی بات کسی کو نہیں کہی۔ مجھے پتہ ہے کہ ان حضرات کی اپنی اپنی تاریخی اور علمی حیثیت ایسی ہے کہ میں ان سے مقابلہ کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور اگر غور سے دیکھا جاے تو میرے اور ان حضرات کے مقابلہ کی کوی تک بھی نہیں بنتی۔ میں ریاضی کے ایک بہت ہی محدود

حصے میں کچھ درک رکھتا ہوں، اور وہ حضرات اپنے اپنےبحر ہاے علوم کے شناور تھے۔ تو بعض حضرات بنا لیتے ہیں زیب داستان کے لیے، تا کہ کسی گرے ہوے بھای کو کچھ اور اذ یت دی جاسکے۔ میں دعا کرتا ہوں ان صاحب کو اللہ تعالی جزا دے کہ انکی وجہ سے میرا دل اپنے مرحوم دادا کی طرف سے صاف ہو گیا۔ اس بات کا امکان ہے کہ ان صاحب نے یہ بات کسی بزرگ سے میرے متعلق سنی ہو اور مجھے محض زچ کرنے کے لیے میرے ساتھ منصوب کرکے کہہ دی ہو، ان بزرگ کے خلاف اپنے دل کا کوڑھ نکالنے کے لیے۔ اگر کسی بزرگ نے ایسی بات کہی تھی تو وہ جانیں اور ان کا خدا، اور صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا، اور کیسے ہوگا۔ اپنی اس رام کہانی میں میں اصل موضوع کو تقریبا بھول ہی چلا تھا۔ اور ہاں ان اینٹوں کے بارے میں میری مرحومہ دادی جان نے بتا دیا کہ بنی تھیں، دبای بھی گیی تھیں لیکن بعد کو نکال کر بیچ دی گیی تھیں، کاروبار میں گھاٹا پڑنے کی وجہ سے۔ خس کم جہاں پاک۔

خاندان سے متعلق بہت سی باتیں تای مریم ، اپنی تایا زاد بہنوں اور ان کے اکلوتے بھای عزیزم عبدالسمیع مرحوم سے سنیں۔عبدالسمیع ہی نے مجھے تاریخ سیالکوٹ سے متعلق ایک کتاب کا بھی بتایا۔ اس کتاب کے مطابق بابر کو جب پہلے حملے میں شکست ہوی تو بہت سے مغل فوجی کوٹلی لوہاراں نامی قصبے میں بس گیے۔ مغربی کوٹلی میں بہت کم مغل آباد ہیں اور ان میں بھی اکثریت حجام اور جراح ہیں۔ غالباً ایک یا دو خاندان ایسے ہیں مغلوں کے جو کہ لوہار ہیں پیشے کے اعتبار سے۔ ۔ہاں مشرقی کوٹلی میں مغلوں کی خاصی آبادی ہے۔ ویسے اب تو کوٹلی لوہاراں سے ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ شخص لوہاروں کا کام کرتا ہے یا لوہاروں کی اولاد ہے۔

عبدالسمیع مجھ سے تقریباً دو سال چھوٹے تھے لیکن گھر خاندان اور اور گاوں کے متعلق مجھ سے بہت زیادہ جانتے تھے۔ ذہین آدمی تھے لیکن اپنی اماں کی یہ خو اہش پوری نہ کرسکے کہ وہ ڈاکٹر بنیں۔ بر طانیہ سے فوٹو گرافی میں ڈپلومہ کرکے آئے اور سپارکو میں ملازم ہو گیے۔ ہومیو پیتھی میں بھی کوئ ڈپلومہ کر رکھا تھا اور پریکٹس بھی کرتے تھے۔اللہ تعالی غریق رحمت کرے بے حد محبت کرنے والی روح تھے۔ کیوں نہ ہو آخر کس ماں کے بیٹے تھے اور کس نانا کے نواسے تھے۔میرے بچوں کو صر ف چچا سمیع ہی یاد ہیں، میرے چچا اور تایا زاد بھایوں میں سے۔ جب میں نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں نوکری کرلی تو میری اماں، اللہ تعالی انکو زندگی تندرستی دے، نے گھر ربوہ منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد میر ے تایا زادوں میں سے جو بھی ربوہ آیا وہ اماں سے ملنے ضرور آیا۔

تایا عبدالمالک مرحوم زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھتے تھے، اس لیے ان سے کرید کرید کر کوی بات پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ ان کے مقابلے پر تایا عبدالخالق مرحوم صحیح معنوں میں خاندان کے سر براہ تھے۔جس قدر ہو سکتا تھا خیال بھی رکھتے تھے۔ اور اگر کوی بات قابل گرفت دیکھتے تھے تو سر زنش بھی کرتے تھے۔انہی سے مجھے دادا جان مرحوم کی خلافت ثانیہ کی بیعت کا واقعہ

معلوم ہوا تھا۔ مجھ پر بہت توجہ تھی، شاید اس لیے بھی کہ میں اپنے دادا کے زندہ پوتوں میں سب سےبڑا تھا، اور شاید وہ مجھے اسی حیثیت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ میری عمر کو دیکھتے ہوے انہوں

نے فیصلہ کیا کہ مجھے کوی کام وام سیکھنا چاہیے۔ایک کارخانے میں لگوا بھی دیا جہاں میں نے

کچھ عرصہ کام بھی سیکھا یا کیا۔ پر میری اپنے ابا کے زیر سایہ اٹھان ہی ایسی ہوی تھی کہ، جونہی حالات درست ہوے میں نے سکول کا رستہ ناپا، با وجود بڈھا اونٹ کے خطابات کے۔ پر بعد کو جب تایا جان نے دیکھا کہ لا علاج ہے تو جب اور جہاں کہیں ان سے مددہو سکی کی۔بلکہ انٹرمیڈیٹ پارٹ ون کا امتحان ہونے کے بعد تو میں اور میرے چھوٹے بھای ناصر احمد مصمم ارادہ کرکے نکلے تھے کہ بس اب چچا عنایت اللہ صاحب کے پاس کراچی جا کر کام کریں گے اور گھر کی حالت سنواریں گے۔ تایا ابا مرحوم خود روہڑی سے کراچی گیے (اس زمانے میں سکھر والے پل کا کام ختم ہو چکا تھا او تایا چھوٹے موٹے ٹھیکے لے کر گزارہ کر رھے تھے) خیر تو مجھے سمجھا بجھا کر پہلے روہڑی لے گیے اور پھر واپس ربوہ بھیج دیا۔ بعد کو ناصر احمد نےگاوں واپس آن کرا سکول جانا شروع کردیا۔

اللہ تعا لی میر ے تمام بزرگوں پر اور عزیزوں پررحمت کرے ان میں سے اکثریت نے ہم بہن بھایوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ اور میری نظر میں یہ سب احمدیت کی برکت تھی، ورنہ کون سوتیلوں کو پوچھتا ہے۔ خاص طور پر ایسے سوتیلوں کو جن کے باپ نےگھر سے بھاگنے کے بعد کبھی گاوں کا رخ بھی نہ کیا تھا۔ جن لوگوں نے اچھا سلوک نہ کیا مجھے ان سے بھی کوی خاص شکایت نہیں۔ اگر میں نے پھر کبھی اپنے پرانے حالات کا ذکر کیا اور اس میں انکا بھی ذکر آگیا تو صرف واقعاتی تسلسل کو قایم رکھنے کے لیے ہوگا۔ ورنہ مجھے اپنے ماضی کے سب کرداروں سے پیار ہے، کیوں کہ میرے کردار کی تشکیل میں وہ سبھی شریک تھے۔